بادبان
مدیرِ اعزازی
ناصر بغدادی

سہ ماہی بادبان | اکتوبر تا دسمبر 2006ء | شمارہ نمبر۔ 11

مدیر اعزازی

ناصر بغدادی

PRICE IN FOREIGN COUNTRIES: US $ 20/=
(By Registered Air Mail)

بادبان میں شائع ہونے والی تحریروں اور ان کے تخلیق کاروں کے نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

قیمت: =/200 دو سو روپے

کمپوزنگ: سسٹم گرافکس 021-2214000
پرنٹنگ: ذکی پرنٹرز کراچی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
URDU QUARTERLY BADBAAN
E-2, 8/14, MAYMAR SQUARE, BLOCK. 14,
GULSHAN-E-IQBAL, KARACHI-75300(PAKISTAN)
Phone: 494-7230
Email:badbaanurdu@yahoo.com

لطیف الزّماں خان

راجندر سنگھ بیدی

"کیا آپ بیدی صاحب سے ملنا پسند کریں گے؟" رضا صاحب نے پوچھا۔

"کسی اور سے ملوایئے یا نہ ملوایئے، بیدی صاحب سے ضرور ملوایئے۔" میں نے جواب دیا۔ ٹیلی فون پر وقت طے ہوگیا۔ رضا صاحب نے اپنے کسی دوست کو ٹیلی فون کیا۔ "پاکستان سے لطیف الزّماں خاں آئے ہیں کل بیدی صاحب سے ملنے جائیں گے۔" معلوم ہوا کہ گوپال کرشن مانک ٹالہ ہر اس شخص سے ملنے کے اُچک ہوتے ہیں جس نے لاہور دیکھا ہے۔ اُردو کے افسانہ نگار، پریم چندر کے عاشق، ممتاز مفتی کے شاگرد، مانک ٹالہ بڑی ہی دل نواز شخصیت کے مالک ہیں۔

بمبئی کے فاصلے! خدا کی پناہ۔

جمعہ ۱۹؍اگست ۱۹۸۳ء دوپہر کے کھانے کے بعد کالی داس گپتا رضا صاحب اور میں، بیدی صاحب سے ملنے کے لیے ٹیکسی میں روانہ ہوئے۔ تمام راستے رضا صاحب مجھے بیدی صاحب کے بارے میں بتاتے رہے۔

اُردو افسانہ کی تاریخ کا یہ عام المیہ ہے کہ ہم اپنے افسانہ نگاروں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ راجندر سنگھ بیدی مرحوم جس مرتبہ کے افسانہ نگار ہیں ابھی ناقدین نے ان کے بارے میں اتنا نہیں لکھا جتنا لکھا جانا چاہیے تھا، پھر بھی، بیدی کے بارے میں زیادہ جاننے کے باوجود اُن کے ہم عصر افسانہ نگاروں کی نسبت ہم مرحوم کے بارے میں زیادہ علم رکھتے ہیں۔ وہ تفصیلات جو بہت عام ہیں ان کے بارے میں کئی حضرات نے لکھا ہے، لیکن بیدی کی حیرت انگیز شخصیت پر اب بھی بڑے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔

خدا بھلا کرے ڈاکٹر قمر رئیس کا، انہوں نے "عصری آگہی" کا بیدی نمبر ان کی زندگی میں شائع کیا۔ پاکستان میں اسی رسالے کا سرقہ نمبر پشاور سے شائع ہوا۔ الزام سے بچنے کے لیے چند مضامین شامل کر لیے گئے۔ پہلے ناشر بغیر اجازت کتاب چھاپ لیتے تھے اب رسالے کے ایڈیٹر اور ادیب بھی دوسروں کی محنت پر ڈاکہ ڈالنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ کتاب "اُردو افسانہ۔ روایت اور مسائل" میں تین مضامین، اطہر پرویز مرحوم کی مرتبہ کتاب "راجندر سنگھ بیدی اور اُن کے افسانے" ڈاکٹر نثار مصطفیٰ کی کتاب "راجندر سنگھ بیدی" (شخصیت اور فن) چند مضامین، بس یہی کچھ، کیا بیدی صاحب اسی سلوک کے مستحق ہیں؟

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ پریم چند کے بعد ترقی پسند تحریک نے چار بڑے افسانہ نگار دیئے۔ کرشن، بیدی، عصمت اور منٹو۔ بعض حضرات یہ اعتراض کریں گے کہ منٹو ترقی پسند نہیں تھا۔ ناقدین میں سے کچھ نے

اعتراضات کیے ہیں اور منٹو کو ترقی پسند نہیں گردانا اس کے باوجود مجھے اس پر اصرار ہے کہ منٹو ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔ چند لوگوں کی انتہاپسندی نے ترقی پسند تحریک اور تنظیم دونوں کو نقصان پہنچایا، لیکن حقیقت سے انکار کیسے ممکن ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ بیدی ان چاروں میں سب سے بڑے ہیں۔ یہ چاروں افسانہ نگار اپنے اپنے مقام پر بلند ترین مقام پر ہیں۔ بیدی کو کشادہ دلی، قوتِ برداشت سے ملی تھی۔ اُنھوں نے بدترین غربت دیکھی تھی۔ زندگی کا ایک ایک دکھ یاد تھا۔ اکثر دوستوں کے سامنے اور بیش تر تنہائی میں روتے۔ کوتاہ نظر حضرات نے اُن کے کثرتِ گریہ کا مذاق اُڑایا مگر وہ بھول گئے کہ

"اشک اگر اشک نہ ہوتا تو ستارہ ہوتا"

اپنے والدِ مرحوم کو بیدی صاحب نے اس طرح مرتے دیکھا تھا کہ علاج کے لیے چند سکے گھر میں نہیں تھے۔ بیدی ساری زندگی تنہائی میں روتے اور گیلی لکڑی کی مانند سلگتے رہے۔ اُس اشک باری اور غم نے اُنھیں وہ کچھ دیا جو اُن کے بہترین افسانوں میں نظر آتا ہے۔ لاجونتی کا شوہر سندر لال اپنی مغویہ بیوی کو اسی لیے قبول کرتا ہے کہ وہ کشادہ دل ہے۔ آنسوؤں نے بیدی کو وہ اعلیٰ درجہ کا وژن دیا کہ اُن کے افسانے کا قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ جیسے ہر مصیبت اس پر ٹوٹ رہی ہو اس کی بہترین مثال ان کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" ہے۔

بیدی نے اُن معنوں میں کردار تخلیق نہیں کیے جیسے منٹو کرتا تھا۔ دراصل بیدی کے ذہن کی زرخیزی نے ایجاد و اختراع کا کام نہیں کیا بلکہ زندگی میں جو کردار جیسا نظر آیا ہے اسے اُنھوں نے بیان کر دیا۔ چناں چہ اپنی خوبیوں، خرابیوں اور خامیوں کے ساتھ انسان ان کے افسانوں میں چلتے پھرتے، لڑتے جھگڑتے، کینکیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ نہایت معمولی انسان کو ہمارے لیے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ مَنی اور لاجونتی جیسے کردار اُردو افسانے کو دے سکے۔ ہر طرح کے لوگ، ایسے جو بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہیں مثلاً سندر لال، ایسے بھی جن میں وفاداری بطور ایک قدر کے مجسم ہوگئی ہے۔ تلادان کا بابو جو اپنے کرب وغم میں جھلس کر رہ گیا، بابو ایک ہری جن کا بیٹا ہے وہ سُکھ نندن کا دوست ہے جو امیر ہے اور اونچی ذات کا بھی۔ سُکھ نندن اپنی امیری اور اونچی ذات کے باوجود بابو کے مقابلے میں بہت چھوٹا، بہت ہی چھوٹا نظر آتا ہے۔ کوارنٹین کا بھاگو جو ایک طاعون زدہ شہر میں انگریز سے لڑنے والوں کا ایک علامتی کردار بن گیا ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے جہاں ڈاکٹر بخشی انعام و اکرام سے نوازے جاتے ہیں اور بھاگو کی بیوی مر جائے تو ماں جائے بھائی بھی مدد کو نہیں آتے۔ تلادان میں ساد ھورام دھوبی کا بیٹا بابو بغیر کسی کے سمجھائے یہ جان لیتا ہے کہ دھن والوں اور عام انسانوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ وہ مرتے دم تک طبقاتی فرق کو نہ بھول پایا۔ گرہن کی ہولی کو اس کا قاری کبھی نہیں بھول پایا۔ عورت کی بے بسی اور بے کسی کی ایسی تصویر شاید ہی کوئی اور افسانہ نگار بنا سکا ہو۔

بیدی کے ہاں رنجیدہ، غم زدہ انسان تو ملیں گے ہی، لیکن بڑے دل والے بھی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بیدی کے ذہن کی زرخیزی کا دائرہ محدود نہیں آسمان کی طرح کشادہ تھا۔ اُن کی سوچ اور فکر میں وہ گہرائی تھی جس

سے خشک فلسفہ نہیں گہری عاقلانہ باتیں کہنے، مکالمے لکھنے اور کہانی سنانے کا فن آتا ہے۔ دوستوں سے ان کی محبت انسانی اقدار کے لیے احترام، ہر قسم کے تصنع سے نفرت، بیدی کی چند خوبیاں ہیں۔

محقق، شاعر اور غالب شناس گپتا رضا صاحب کہہ رہے تھے، بیدی کے والد ضلع سیال کوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں دتے کی کے رہنے والے تھے۔ بیدی یکم ستمبر 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ہیرا سنگھ کھشتری اور ماں سیوادئی برہمن تھیں۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم، مختلف ملازمتیں، شادی، چار بچے، ایک بھر پور عشق، فالج اور پھر کینسر نے 11 نومبر 1984 کو انہیں دائمی نیند سلا دیا۔

اُن کی شادی شدہ زندگی باوجود غربت کے ابتدائی ایام میں بہت اچھی تھی۔ بمبئی میں گندگی ہے تو حُسن بھی بے پناہ ہے۔ ہندوستان میں پائے جانے والی ہر نسل کے لوگ وہاں ملتے ہیں۔ بیدی صاحب کا بیٹا نریندر فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھا اس کی خواہش تھی کہ بیدی صاحب فلم کے لیے ایسی کہانی لکھیں جس سے پیسہ ملے مگر بیدی دوسروں کی کہانیوں کے مکالمے تو لکھ سکتے تھے، لیکن اپنے قلم سے ایسی کہانی لکھنے پر آمادہ نہیں تھے جس سے قلم کی حرمت پر آنچ آئے۔ باپ کا جواب سُن کر نریندر الگ ہو گیا۔

بیدی کی اہلیہ سوما وتی کی زندگی میں خلا پیدا ہوتا چلا گیا۔ فلم ''آنکھن دیکھی'' بنتی رہی اور گھر میں میاں بیوی کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ بیگم بیدی نے اپنی زندگی کے آخری ایام حد درجہ پریشانی، تنگی اور دُکھ میں گزارے اور جب وہ مر گئیں تو بیدی ہر ایک سے کہتے ''میں نے اسے جلا جلا کر مار ڈالا۔''

بمبئی میں اُنہوں نے فلمی حلقوں میں بڑا مقام بنا لیا تھا۔ داغ، دیوداس، مدھومتی، انورادھا اور غالب جیسی فلموں کے مکالمے اور منظر نامے لکھے تو اُن کی شہرت کتنے ہی ادیبوں کے لیے جو فلم سے وابستہ تھے حسد کا باعث بنی اور راما نند ساگر جیسے لوگ بھی انتہائی گھٹیا پن پر اُتر آئے، لیکن بیدی صاحب ہمیشہ صاف دل اور صاف باطن رہے ۔ وہ قلم کے لیے حیرت، اپنے لیے انبساط و مسرت کے ساتھ دُکھ اور غم کی بلند ترین چوٹی کو چھو آئے۔

بیدی کا ذہن اور اُن کا قلم ساتھ ساتھ چلتے۔ جو کچھ وہ سوچتے اسے بیان کرنے پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ اپنے پہلے ہی مجموعے دانہ و دام میں اپنے وجود کی خوشیوں اور غم کا اظہار کرتے ہیں۔ لاہور اُن سے چھپ گیا تو اُن کی باقی ماندہ زندگی میں قہقہہ کم اور دھوپ زیادہ رہی۔ بمبئی کے قیام میں تھوڑا سا عرصہ خوش حالی کا ضرور آیا مگر وہ اُن کے دُکھوں کا مداوا نہیں تھا۔ دُکھ جو اُن کے والدین اور خود اُنہوں نے اُٹھائے تھے، چناں چہ اُن کے بیشتر کرداروں میں مصائب، غم اور آنسوؤں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب زندگی میں لُطف تھا، دوست احباب کا قُرب حاصل تھا۔ کرشن چندر جادو جگاتے اور بیدی کہانی لکھتے تھے، لیکن افسوس کہ چشم زدن میں صحبت یار آخر شد۔

اب اُنہیں زندگی کا ایک مختلف رُوپ نظر آیا۔ بیدی نے زندگی کو ''کُل'' کے روپ میں دیکھا۔ زندگی میں صرف روشنی ہی نہیں تاریکی بھی تھی۔ صرف قہقہے ہی نہیں آنسو بھی تھے۔ یہی نہیں دیکھا کہ بُرے انسان تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ اچھے انسان عام طور پر مصائب جھیلنے پر مجبور ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نیکی کرتے ہیں مگر نیکی خود بخود دریا بُرد ہو جاتی ہے۔ نیکی کو سدا انعام نہیں ملتا بدی کو ہمیشہ سزا نہیں ملتی مختصر یہ کہ اُنہوں نے زندگی کا اصل رُوپ

دیکھا جیسی کہ وہ ہے۔ مفلسی، بھوک اور بیماری سے گزر چکے تھے۔ ہوش سنبھالا تو ماں کو ہمیشہ بیمار دیکھا۔ بچپن کے امراض نے بیدی کو بے حد حساس اور رقیق القلب بنا دیا تھا۔ اُن کی زندگی آنسوؤں کا تار اور غم کا تسلسل تھی۔ وہ دوستوں کی دعوتیں کرتے، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں اُن کا جواب نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آتش کے شعر

ضبط گریہ سے جلا کرتی ہیں آنکھیں، سچ ہے
بند ہونے سے ہے ناسور کا بہنا بہتر!

کی مکمل تفسیر تھے۔

ٹیکسی ایک ہلکے سے جھٹکے سے ساتھ رُک گئی۔ ایک صاحب کو منتظر پایا۔ دُبلے پتلے، درمیانہ قد، پیشانی چوڑی، آنکھوں پر چشمہ، عمدہ لباس "یہ مانک ٹالہ ہیں" رضا صاحب نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ جلدی جلدی جی۔ کے کی کار میں بیٹھے۔ معلوم ہوا بیدی صاحب دروازہ پر منتظر ہوں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم تینوں ۳۴۷ لنکنگ روڈ کھار بمبئی بیدی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ لکڑی کے زینے کی آخری سیڑھی پر وہ خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے تھے۔

قد چھوٹا، سر پر روایتی سفید پگڑی، الٹی آنکھ دبی ہوئی، آنکھوں پر چشمہ، ترشی ہوئی ڈاڑھی مونچھوں پر خضاب، ناک ذرا موٹی سی، رنگ کبھی گندمی رہا ہوگا مگر اب سنولا گیا تھا، جسم پر بش شرٹ جو اُن کے دبلے پن کی وجہ سے بڑی معلوم ہوتی تھی، ڈھیلی ڈھالی پتلون پاؤں میں کپڑے کے بنے ہوئے آرام دہ جوتے' ہاتھوں کی انگلیاں موٹی، نقاہت کے باوجود اُنہوں نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں نے بہت غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا۔ سیدھی آنکھ بہت روشن' بہت سوچتی ہوئی معلوم ہوئی۔ یقیناً کبھی اُن آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت کی چمک بڑی نمایاں رہی ہوگی۔

وہ آہستہ آہستہ زینہ طے کر رہے تھے۔ ہم بیدی صاحب کے کمرے میں تھے۔ لکڑی کا ایک تخت، نہایت معمولی ایک میز، تین کرسیاں، گنتی کی چار کتابیں، ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیر کمرے میں ادبا شعرا مہینوں نہیں سالوں رہے اور بیدی کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ یہ اُس انسان کا کمرہ تھا جس سے لوگ جھوٹی باتیں بنا کر روپیہ وصول کرتے رہے، یہ اُس انسان کا کمرہ تھا جو انسانی اقدار کو اپنے دُکھے ہوئے دل میں بسائے ہوئے تھا، یہ اُس انسان کا کمرہ تھا جو ہر پریشاں حال اور ستم زدہ انسان سے عملی ہمدردی کو ایمان کا جزو سمجھتا تھا' جس میں انکساری اور انسانی ہمدردی مجسم ہو گئی تھیں' جس کی دل جوئی، خاطر داری اور دل آسائی کے کتنے ہی واقعات جناب ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب نے سنائے تھے۔ یہ اس انسان کا کمرہ تھا جو خود بھوکا رہا مگر مہمان نوازی پر حرف نہ آنے دیا' جو قرض لے کر دوسروں کی مدد کرتا رہا۔ یکا یک مجھے الکزینڈر فلیمنگ یاد آ گیا جس نے ایک معمولی سی لیبارٹری میں پنسلین ایجاد کیا تھا۔ امریکی جب اس لیبارٹری کو دیکھنے گئے تو بڑے حیران ہوئے۔ ایک امریکی بولا" یہ تو ایک پرانے فیشن کے ڈرگ اسٹور کا پچھلا حصہ معلوم ہوتا ہے۔" اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ پنسلین جیسی چیز اُس تاریک کمرہ میں دریافت ہو سکتی تھی۔ فلیمنگ ہنس پڑا اور جب ڈیڑوات میں چمکتی، ایئر کنڈیشنڈ لیبارٹریز اسے دکھائی گئیں تو فلیمنگ نے کہا:

"ایسے لیبارٹریز میں پنسلین دریافت نہیں ہو سکتی۔"

اگر بیدی نے آرام و آسائش کی زندگی گزاری ہوتی، تاریک کمروں میں نہ رہے ہوتے جس طبقہ میں پیدا ہوئے تھے اسے بھول گئے ہوتے تو بھولا' چھوکری کی لوٹ' گرہن' گرم کوٹ' دس منٹ بارش میں' لمبی لڑکی جیسے افسانے اور ایک چادر میلی سی جیسا خوب صورت ناولٹ نہیں لکھ سکتے تھے۔ بیدی صاحب کی آواز آئی

"لاہور کیسا ہے؟"

میں چونکا جیسے لاہور کسی شہر کا نہیں ایک فرد کا نام ہو۔

"وہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"لاہور کو بمبئی مت بننے دو۔ اس کا بے مثال حُسن غارت ہو جائے گا۔"

بیدی صاحب نے کہا۔

مگر وقت کی رفتار کون روک سکا ہے۔

"کیا حال ہے اس کا.... مرزا.....؟"

"میرزا ادیب؟"

"ہاں ہاں"

"وہ مٹی کا دیا ہاتھ میں لیے ناخن کا قرض ادا کرنے میں مصروف ہیں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"کتابیں لکھ رہے ہیں اور گلڈ سے انعامات وصول کر رہے ہیں"۔

بیدی صاحب اٹھے اور کچھ کتابیں اٹھا لائے۔ پھر اُن پر کچھ لکھنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا اور وہ بمشکل لکھ پاتے تھے۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آئے اور پانچ کتابیں عنایت فرمائیں۔ گرہن' کوکھ جلی' سات کھیل' ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' ایک چادر میلی سی۔ (یہ کتابیں اب گوشہ رشید احمد صدیقی' سینٹرل لائبریری' بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی' ملتان میں محفوظ ہیں)

بڑی لجاجت سے بولے "بس یہی موجود ہیں" باقی کتابیں نہ ہونے پر جیسے وہ شرمندہ ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک کتاب "راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے" مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز' قمر رئیس صاحب کا "عصری آگہی" راجندر سنگھ بیدی خصوصی شمارہ پیش کیا اور درخواست کی کہ دستخط فرما دیں۔

"کیا احمد ندیم قاسمی اب بھی پنجاب کے دیہاتوں کے بارے میں افسانے لکھتے ہیں؟" بیدی صاحب نے پوچھا۔

"افسانے میں قاسمی صاحب کا ٹوٹل کنٹری بیوشن تو پنجاب کے کسانوں اور دیہات کے لوگوں کے بارے ہی میں ہے بلکہ ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں ڈکشن دیہات ہی سے متعلق ہے" میں نے عرض کیا۔

"افسوس یہاں نہ لاہور سے کتابیں آتی ہیں نہ رسالے"۔

''آپ لاہور تشریف لایئے' کیا آپ کو لاہور یاد نہیں آتا؟ سب آپ کا استقبال کریں گے۔ عصمت آپا سے پوچھئے وہ پاکستان ہو آئی کیا انہیں کسی ملک میں ایسا ریسپشن ملا ہے؟ آپ کا استقبال بھی ویسا ہی ہوگا۔ آپ آیئے تو سہی''۔

''میں لاہور پہنچ تو جاؤں گا مگر زندہ واپس نہ آ سکوں گا'' وہ لاہور کو یاد کر کے رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے ''آؤں گا' اگلے سال آؤں گا' قاسمی کے ہاں ٹھہروں گا' کہہ دینا''۔

کولڈرنک کے بعد ہم چاروں نیچے اتر آئے۔ سڑک کے کنارے ایک پان شاپ سے بیدی صاحب نے پان کھایا۔ طے یہ پایا کہ مانک ٹالا صاحب کے ہاں چائے پی جائے گی پھر شب کا کھانا کھایا جائے گا۔ نہ جانے کس نے کہا ''ایک گروپ فوٹو بنوالیں'' قریب ہی اسٹوڈیو تھا۔ وہاں پہنچے تو بیدی صاحب بہ ضد ہوئے ''آپ کرسی پر بیٹھئے آپ مہمان ہیں''۔

''نہیں بیدی صاحب میں یہ بےادبی نہیں کرسکتا میری تربیت ایسی نہیں ہوئی''۔

میں نے کہا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ گئے تو میں ان کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ برابر کی کرسی پر رضا صاحب تھے اور ان کے پیچھے گوپال کرشن مانک ٹالا لاہوری کھڑے ہوگئے۔

بہت جلدی سینیڈ اپارٹمنٹس پالی ہل کھار پہنچ گئے۔ جی کے کا فلیٹ نہایت خوبصورت ان کے دل کی طرح تھا۔ چائے' کچھ نمکین چیزیں اور پھر شراب آ گئی۔ ابھی سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ کمرے میں ایک بے حد مہذب' باوقار خوش رفتار' خوش گفتار' خوش پوشاک خاتون داخل ہوئیں یہ بیگم مانک ٹالا تھیں۔ انہوں نے کہا ''تھوڑی دیر میں گلشن باورا پہنچنے والے ہیں' یہ ایک فلمی شاعر ہیں اور بیدی صاحب کے مکالموں کے عاشق۔ رضا صاحب کہہ رہے تھے ''دراصل بیدی صاحب کو تنہائی نے ڈس لیا ہے اگر احباب کی ایسی محفلیں جمتی رہیں تو یہ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے''۔ بیدی صاحب ہنسے پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سکھوں کے لطائف سنانے لگے۔ گلشن باورا آ گئے۔ نہ رضا صاحب شراب پیتے ہیں نہ میں۔ بیدی صاحب نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کے بارے میں کوئی جملہ کہا اور شراب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا ''ڈاکٹر نے اجازت دی ہے؟''۔

''صرف ایک پیگ کی''۔

''تو آپ اتنی ہی پیجئے گا'' میں نے کہا۔

گلشن باورا شراب اس طرح پی رہے تھے جیسے گرمیوں میں ملتان کے لوگ ''ٹھنڈا ٹھار'' پانی پیتے ہیں۔

''کیا آپ کبھی مجروح سے ملے ہیں؟'' بیدی صاحب نے پوچھا۔

''صرف ایک مرتبہ کراچی میں سلطان صاحب کتب فروش کی دکان پر نیاز حاصل ہوا تھا''۔

''آپ ان سے ضرور ملیے وہ ہماری ترقی پسند تحریک کے بہت بڑے شاعر ہیں بہت ہی پیارے انسان ہیں''۔ بیدی صاحب آہستہ آہستہ بول رہے تھے بڑے محبت سے مجروح صاحب کو یاد کر رہے تھے۔ پھر اختر الایمان صاحب کا ذکر آ گیا۔ ''اب یا تو وہ مصروف ہو گئے ہیں یا تنہائی پسند۔ کیوں رضا صاحب اچھا شاعر ہے

تا؟"۔

شراب وہ قطرہ قطرہ پی رہے تھے جیسے ختم ہو جائے گی تو اور نہ ملے گی پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "صاحب آپ نے ئلا کی نثر پڑھی ہے؟ غالب شناسی کا دیباچہ پڑھیے کیا غالب پر ایسا بھی لکھا جا سکتا ہے؟"۔

گلشن باورا دھاڑے "او جی غالب کیا' وہ اپنا ساحر بہت بڑا شاعر تھا' مگر تھا نا مرد۔ مجھے ہزار روپے دیتا فلاں فلم ایکٹرس سے میرے معاشقہ کا پروپیگنڈا کرا دو' او جی میں ایسا ہی کرتا تھا..... میں کیا جی کئی لوگ ساحر کے لیے ایسا پروپیگنڈا کرتے تھے جی"۔

گلشن باورا نہایت قیمتی شراب کی بوتل ختم کر چکے تھے "ہاں جی وہ زیندر....."۔

ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی ایٹم بم پھٹ گیا۔ بیدی صاحب کو چپ لگ گئی پھر انہوں نے بول کر ندیا۔ انہوں نے اپنا پیگ بھی پورا نہ کیا تھا ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ گلشن باورا جا چکے تھے مجبوراً جی کے نے کار نکالی اور ہم تینوں بیدی صاحب کو ان کے گھر پہنچا آئے۔ مجھے اس شام کے غارت ہونے کا ملال آج تک ہے۔ روپیہ لے کر پروپیگنڈا کرنے والے کتنے حقیر اور ذلیل ہوتے ہیں اس کا اندازہ اُس روز ہوا۔

سمندر میں واقع "ہوٹل سی راک" میں کھانے کا انتظام تھا۔ شب کو بارہ بجے کے بعد اٹھے تو ہم تینوں بیدی صاحب کی وجہ سے غم زدہ تھے۔

شب کا باقی حصہ میں نے جاگ کر گزارا۔ جی کے اور رضا صاحب کی بتائی ہوئی باتیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ اچھا تو بیدی صاحب کے ساتھ یہ بھی ہوا۔ فلمی دنیا کی اپنی منطق ہے وہاں بڑے سے بڑا پارسا اپنے دامن کو آلودگی سے نہیں بچا سکا۔ بیدی انسان تھے جسم کے دل آویز خطوط اور وہ بھی کسی کم بخت کے۔ اگر فلم نے ان کی نیکی' نیک نامی' شرافت اور ملنساہٹ کو داغ دار کیا تو کیا ہوا انہیں بہت کچھ دیا بھی۔ ان کی تحریروں کی زبان آسان ہو گئی اُردو اور ہندی کا ملن ہوا۔ بیدی صاحب نے اس ملن کے لیے شعوری کوشش کی۔

بیدی نے جتنے نسوانی کردار تراشے ہیں وہ مجھے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ ان کے بیش تر افسانوں میں مرکزی کردار عورت ہی کا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کردار رومینٹک نہیں ہیں۔ یہ عورتیں حسین نہیں ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی جنسی کشش نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی سکس سمبل نہیں ہیں۔ شکل و صورت کے اعتبار سے بہت معمولی بلکہ اس سے بھی کم تر درجہ کی مخلوق ہیں۔ ان کے پاس نمائش کے لیے بھی کچھ نہیں۔ وہ مرد کی ہوس کا شکار ہوتی ہیں مگر خود عیاش نہیں ہیں۔ ان عورتوں کی بے زبانی' زبان بن رہی تھیں۔ مثلاً کلیانی اور کیرتی۔ عورت کی زندگی میں کیسی کیسی مجبوریاں ہیں۔ کیرتی سے پوچھیے اُس کا حال پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ معاشرہ میں کس قدر کمینگی ہے۔ اس کے باوجود زندہ رہنا پڑتا ہے اور یہاں بیدی ایک کم زور عورت میں وہ ہمت پیدا کر رہے ہیں۔ اسے وہ طاقت عطا کر رہے ہیں جس سے وہ بڑی سے بڑی رکاوٹ کو دُور کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ مصائب و تکالیف اور تباہی و بربادی سے مفر نہیں' لیکن زندگی کی بنیادی اچھائی مٹ نہیں جاتی خود بخود نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔

بیدی صاحب کی زندگی میں آخری موڑ اس وقت آیا جب وہ زندگی کی گہرائیوں میں اُترتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی گہری المیہ سے دوچار ہوئی۔ اب جنس اور جسمانی کشش کا قصہ نہیں تھا۔ ان کی حالت وہ تھی جو گیتا بالی

(قلم ایکٹریس) کی زندگی کے آخری دو سال میں رہی ہوگی۔ قلم "آنکھن دیکھی" بن رہی تھی اور بیدی اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔ بیوی امراض کا شکار ہوئی اور مرگئی۔ بیدی اعتراف نہیں کرتے اور روتے "میں نے اسے جلا جلا کر مار ڈالا...... میں نے نریندر اور کبیر کی ماں کو مار ڈالا"۔

ماں کے مرنے کے بعد نریندر پھر باپ کے پاس لوٹ آیا۔ اس خواہش کے ساتھ کہ بیدی قلم کے لیے اس طرح لکھیں جیسے دوسرے لوگ لکھ رہے تھے اور دولت سمیٹ رہے تھے، لیکن اول تو بیدی ایسا کر نہیں سکتے تھے دوسرے یہ کہ اُن کے قلب و ذہن کو بڑے شدید دھچکے لگے تھے۔ نریندر کو عورت اور شراب نے موت سے ہم کنار کر دیا۔ اب بیدی کی زندگی میں خلا ہی خلا تھا۔ غم جو انہیں بچپن ہی سے اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا اس سے نجات کا راستہ نظر نہ آتا تھا۔ حالات نے انہیں ایسی کھائی میں دھکیل دیا تھا جہاں انہیں کوئی چیز قدر کی حامل نظر نہ آتی تھی۔ محبت، دوستی، لگاؤ، وفاداری، عشق، ہر قدر انہیں جھوٹی اور کھوکھلی معلوم ہونے لگی۔ ان پر 1979ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ بمبئی بڑا بے رحم شہر ہے۔ فاصلے اور مصروفیات، روزی کمانے کے "دھندے" انسان کو مجبور و بے بس کر دیتے ہیں۔ سوائے مجروح صاحب سلطان پوری اور جناب باقر مہدی کے تمام احباب بمبئی کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔

اب بیدی صاحب کے لیے دنیا ایسی سڑی ہوئی چیز تھی جس میں سے سڑاہند اور بساہند کے بھبکے پھوٹ رہے تھے اور یہ غلاظت اور گندگی اُن کے وجود کے دھارے کو چھو رہی تھی، لیکن انہیں تو زندگی سے پیار تھا۔ مایوسی جو موت سے بدتر تھی بیدی اس کے شکنجوں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان کا دوسرا بیٹا کبیر بیدی جو جرمنی جا کر وہیں کا ہو رہا، جرمن عورت کی گرفت کتنی مضبوط ہوگی کہ وہ اپنے باپ کو بھول گیا، اپنی زمین کو بھول گیا، نریندر کی بیوہ نے ایسی خدمت کی کہ اس کی شکل میں وہ اپنے مرحوم بیٹے کو دیکھتے تھے "زندہ ہوتا تو اسی طرح خدمت کرتا" انہوں نے دوسرے دن کہا تھا۔

"نامراد" کی ہیروئن جو کھلنے سے پہلے موت کی آغوش میں جا سوئی، گھمنڈی جو شرابی ہے اور آتشک کا مریض جو اپنی ماں کے خیال میں جوان ہو گیا ہے، پوسٹ ماسٹر بھولو رام جسے ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی راس نہیں آتی اور وہ دوبارہ ملازم ہو کر مرتا ہے "صرف ایک سگریٹ" کا سنت رام جو "تھوڑے پانی والے پوکھر کی کیچ میں بھینس کی طرح لوٹنے لگا ہے"۔ ببل کا درباری لال جسے ستا دنیا کا اسفل ترین انسان سمجھتی ہے۔ "ایک باپ بکاؤ ہے" کا گاندھر وداس جو جنسی لذت کا پیکر ہے، یہ کردار انسان کی جبلی خواہشات کا سمبل ہے۔ متھن کی کیرتی جسے دیکھ کر گن کا گلا سوکھ گیا تھا۔ ایسے کتنے ہی کرداروں اور کہانیوں کا خالق کینسر میں مبتلا ہو رہا تھا۔

کیا بیدی اپنے عہد ہی کے افسانہ نگار ہیں؟ میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ جب تک انسانی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت باقی ہے بیدی کے افسانے پڑھے جائیں گے۔ بعض لکھنے والوں میں ان کی ذہانت اور فکر پیچیدہ راستہ اختیار کرتی ہے۔ ماضی میں غالب اور اگر حال کی مثال لینی ہو تو مسعود اشعر اور ڈاکٹر انور سجاد کو پڑھیے۔ بیدی صاحب کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ شاعری میں علامتوں کا استعمال تو صدیوں سے ہو رہا ہے۔ بیدی نے بھی زبان کے اس رُخ کو بڑے سلیقہ سے برتا ہے۔ انہوں نے علامتیں اور اساطیر ہندوستان ہی کی مٹی سے لی ہیں اور بالخصوص پنجاب سے یہ نہیں کیا کہ "ککوکا" رہے تو پنجاب میں مگر زبان استعمال کرے میلول کے اہب کی یہ

کام جدیدیوں نے کیا اور نا کام ہوئے۔

بیدی، کرشن، منٹو اور عصمت ہم قد افسانہ نگار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیدی نے انسانی فطرت کا مشاہدہ زیادہ گہرائی سے کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کرشن چندر نے ظلم کے خلاف قلم اٹھایا، منٹو نے طوائف اور عورت کی مظلومیت کے خلاف بہت تندی اور تیزی سے لکھا، عصمت نے نوجوان لڑکیوں کی گھٹن کو بے نقاب کیا مگر عام انسان کی زندگی میں پائی جانے والی حقیقتوں کا حال جس طرح بیدی بیان کرتے ہیں شاید اُردو کا کوئی افسانہ نگار نہیں کر سکا انسان کی کمزوریوں اور برائیوں سے نفرت کرنا بیدی کے نزدیک کفر ہے۔

منٹو نے کہا تھا" بیدی بہت سوچ کر لکھتے ہیں" غلط نہیں کہا تھا۔ بیدی بڑے تحمل سے انسانی کرداروں کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کرتے ہیں اور بڑے غور و خوض کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ایک ایک تفصیل کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زندگی کا علم ان کے لیے محض عادت نہیں بن گیا بلکہ ایک الہامی چیز جس میں ان کے اپنے احساسات شامل تھے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان میں وہ قوت پیدا ہوئی جس نے انہیں اپنے ہم عہد اور ہم عمر افسانہ نگاروں میں اہم اور بلند مقام عطا کیا۔

بیدی صاحب نے برصغیر میں رہنے والے مختلف عقائد، نسل و رنگ کے لوگوں کو دیکھا اور برتا تھا۔ خود ایسی غربت دیکھی تھی کہ اکثر اس خیال سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اُن کی والدہ دِق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر مری تھیں۔ علاج کے لیے پیسہ کیا پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ ان کے والد مریضہ کو کہانیاں سُنا سُنا کر علاج کرنا چاہتے تھے۔ ماں کی موت نے بیدی صاحب کے دل میں ناسور کر دیا اور یہ آخری دم تک رہا۔ ۱۹۳۸ء میں باپ مر گئے اور گھر کا سارا بوجھ ان پر آ پڑا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صرف غربت ہی نہیں دولت کی چیرہ دستیاں بھی دیکھی تھیں۔ لاہور، دِلّی، سری نگر اور پھر بمبئی، انسانوں کا پھیلا ہوا وسیع و عریض سمندر، انہیں ہر قسم کے افراد سے پالا پڑا جو مختلف اقسام کے مصائب، جذبات، حماقتوں، نیکیوں، برائیوں اور نیک و بد مقاصد میں مبتلا مگن اور سرگرداں تھے۔ بیدی کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ کیجئے تو یوں معلوم ہوگا جیسے وہ ان کے خیالات و احساسات میں داخل ہو گئے ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تمام مصائب خود ان پر بیت گئے ہوں۔

۲۰ اگست کو میں دن بھر کتابوں کی دکانوں میں غالب اور بیدی کی کتابیں تلاش کرتا رہا اور شام کو تنہا بیدی صاحب کے ہاں پہنچا معلوم ہوا سیر کو گئے ہیں۔ نریندر کی بیوہ نے مجھے بیدی صاحب کے کمرے میں بٹھا دیا۔ بیدی صاحب کے کمرہ میں خود بیدی صاحب کی کتابیں موجود نہ تھیں چند مجموعے گزشتہ شام محبت کے چند الفاظ اور دستخطوں کے ساتھ مجھے مرحمت فرما چکے تھے۔ ۲۲ اگست کی شام کو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کرشن چندر کی ایک کتاب نہیں تھی۔

بیدی صاحب واپس تشریف لائے تو چہرہ پر بشاشت کے آثار تھے۔ مرض اور اس کے علاج کے بارے میں گفتگو کرتے رہے" آپ کا کہانی لکھنے کو جی چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں نازل ہوتی ہے۔ لکھوں گا ضرور لکھوں گا۔ ذرا صحت کچھ اور بہتر ہو جائے"۔

انگلیوں میں رعشہ باقی تھا اس حد تک کہ وہ بمشکل چند الفاظ لکھ پاتے تھے۔

"آپ نذیر سے ملے ہیں"

"جی نہیں۔کون نذیر؟"

"ارے بھائی اپنا نذیر احمد"۔

"پرنسپل نذیر احمد صاحب"۔

ہاں ہاں وہی نذیر احمد۔کیا وہ اب بھی صدا لگاتا ہے؟ ضرور صدا لگاتا ہوگا۔لاہور میں وہ اکیلا ہی صدا لگانے والا فقیر ہے باقی سب دکانیں ہوں گی' مجھے سجاد باقر رضوی صاحب کا شعر یاد آیا

تیرے کرم کے باب میں کیا کچھ لکھا گیا
کتنے فقیر اور ہماری صدا کی تھے؟

مرحوم نریندر کی بیوہ میرے لیے کولڈ رنک لے آئی "میری بڑی خدمت کرتی ہے اب یہی میرا بیٹا ہے یہی بیٹی ہے" بیدی صاحب کا جی بھر آیا اور بے اختیار رونے لگے۔میں نے انہیں گلے لگا لیا اور تسلی دینے لگا تھوڑی دیر کے بعد جب طبیعت سنبھلی تو کیسٹ پلیر آن کیا۔فریدہ خانم گا رہی تھیں۔

کہاں وہ' کہاں یہ مقام

"کبھی آپ نے فریدہ خانم کی آواز کو دھیان سے سنا ہے؟"

"جی......مگر لتا اور......"

"نہیں۔نہیں' مہدی حسن' غلام علی اور فریدہ خانم جیسے سُر خدا نے کم ہی عطا کیے ہیں۔آپ لاہور پہنچ کر فریدہ خانم کے کیسٹیں بھیجئے گا"۔

"ضرور بھیجوں گا"۔

مگر افسوس میں یہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔یہی نہیں بلکہ دلّی سے امرتسر آتے ہوئے منّی پبلا (Minni Pabla) نے خواہش کی تھی کہ اسے غلام علی کی ایسی تصویر بھیجوں جس پر ان کے دستخط ہوں۔ہزار جتن کیے مگر غلام علی صاحب کی تصویر حاصل نہ کر سکا۔ہمارے گائک جو ہندوستان میں پوجے جاتے ہیں اور یہاں ان کی قدر نہیں ہوتی پھر بھی وہ کتنے فاصلے رکھتے ہیں کہ عام انسان کی رسائی ان تک نہیں ہے۔

میں نے دو کتابیں ان کے سامنے رکھ دیں۔

"اپنے دُکھ مجھے دے دو" اور "مکتی بودھ"۔

دستخط کر دیجئے۔

رات کے نو بج رہے تھے بیدی صاحب کے سونے کا وقت ہو گیا تھا۔میں نے اجازت چاہی۔

"یہ آپ اور لیتے جایئے" گفتگو کا ترقی پسند ادب نمبر دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔اب اُن کے کمرہ میں کوئی کتاب اور رسالہ نہ تھا۔

"بیدی صاحب' بعد کے افسانوں میں آپ کو اپنا کون سا افسانہ سب سے زیادہ پسند ہے؟"

"کتنی بودھ دیکھ لیجیے گا" پھر پوچھا۔

"آپ کب واپس جائیں گے؟"۔

"۲۶ اگست کو"۔

"۲۲ کو چلیے دلّی تک ساتھ رہتا"۔

"کوئی خاص کام ہے دلّی میں؟"۔

"ہاں ذیل سنگھ صاحب سے درخواست کروں گا کہ میری فلم ریلیز کروا دیں تو روٹی کھاؤں' میں نے قرض لیا تھا اس پر سود اتنا ہو گیا ہے کہ میں اس وقت ادا نہیں کر سکتا"۔

یہ وہی بیدی تھے جن کے پاس دو کاریں ہوتی تھیں' شاعر و ادیب ان کے گھر مہمان رہتے تھے جو ہر ضرورت مند کے لیے تڑپ اٹھتے اور اپنی بساط سے زیادہ اس کی مدد کرتے تھے' یہ وہی بیدی تھے جو کسی باپ کی زبان سے بیمار بیٹے کا حال سن کر دکانوں میں وہ ادویات تلاش کرتے تھے جس سے بچے کو افاقہ ہو جائے اور اردو کا اتنا بڑا افسانہ نگار اس فکر میں تھا کہ فلم ریلیز ہو جائے تو روٹی کھائے۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

اب آخر میں ایک بات اور۔ میرے ذخیرۂ کتب میں گرہن کا دوسرا ایڈیشن ہے [1] جسے نیا ادارہ لاہور نے شائع کیا تھا۔ گرد پوش کے پشت پر کسی آرٹسٹ نے جو تصویر بنائی ہے اسے دیکھیے وہ کینسر کی تصویر ہے اور راجندر سنگھ بیدی کی موت کینسر ہی سے واقع ہوئی۔

---

[1] گرہن کا دوسرا ایڈیشن اب گوشہ رشید احمد صدیقی' سنٹرل لائبریری' بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی میں محفوظ ہے۔